اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے آئندہ نسلوں کی اصلاح نہایت ضروری ہے

(فرمودہ ۲۸ ؍اکتوبر ۱۹۳۸ء بمقام دہلی)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

''ہر ایک قوم کے کچھ آداب ہوتے ہیں جن کو اگر وہ ملحوظ نہ رکھے تو اپنے ماحول کو کبھی درست نہیں کر سکتی۔ میں آج کا مضمون بیان کرنے سے قبل یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد میں ایسے مواقع پر جب کہ خطبہ ہو رہا ہو یا کوئی تقریر کی جارہی ہو چھوٹے بچوں کو پیچھے بٹھانے کا ارشاد فرمایا ہے تا کہ ان کے شور وغل سے وہ مقصد ضائع نہ ہو جائے جس کو حاصل کرنے کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری عبادتیں میلہ نہیں ہیں اور نہ ان کی یہ غرض ہے کہ محض ان سے وقتی سُرور حاصل کیا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں عُرسوں نے لوگوں کو یہ عادت ڈال دی ہے کہ ایسے موقعوں کو کھیل اور تماشہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے نہ کہ کسی سنجیدگی کی نظر سے اور جب بچپن سے ہی ان اجتماعات کے متعلق یہ خیالات دلوں میں راسخ ہو جائیں کہ وہ تماشہ ہیں تو پھر ایسے موقعوں سے سنجیدگی اور پوری توجہ کے ساتھ کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب ایسی مجالس ہوں تو بچے پیچھے رکھے جائیں کیونکہ اگر وہ لوگ جن کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے

پیچھے رہیں گے تو جماعت ان کے مشوروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گی۔ پس ضروری ہے کہ آگے بڑے آدمی ہوں، پھر بچے ہوں اور پھر عورتیں۔ عورتوں کو سب سے پیچھے اس لئے نہیں رکھا جاتا کہ وہ ادنیٰ ہیں بلکہ اس لئے رکھا جاتا ہے کہ ان کے آگے پردہ کی دیوار کے طور پر کھڑے ہو سکیں۔

اس مختصر سی نصیحت کے بعد اب میں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ قومی تربیت کے ہمیشہ دو دَور ہوتے ہیں جس طرح جسمانی تربیت کے بھی دو دَور ہوتے ہیں اور یہ دونوں دَور متقابل چلتے ہیں گویا افراد کی ترقی اور قوم کی ترقی ایک ہی اصول پر مبنی ہے۔ اس نقطہ نگاہ کے ماتحت جب ہم افراد کی حالت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تربیت کا ایک دور وہ ہوتا ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور دوسرا دور اس وقت ہوتا ہے جب بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔ پہلے دور میں بچہ کی غذا وغیرہ کا انتظام خود خدا تعالیٰ کرتا ہے لیکن دوسرے دَور میں ان امور کو صرف خدا تعالیٰ پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ ماں باپ بچہ کی جسمانی تربیت اور کھانے پینے کی طرف خود توجہ کرتے ہیں اور اس کی خوراک اور لباس وغیرہ میں ان کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اس دوسرے دَور میں بچہ کی تربیت کا کام اس کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں اذان دی جائے۔[1] اب دیکھو اذان عربی زبان میں ہے اور بچہ اِسے نہیں سمجھ سکتا مگر باوجود اس کے شریعت نے حکم دیا ہے کہ اس کے کان میں اذان دی جائے اور یہ خالی از حکمت نہیں بلکہ جبکہ علم النفس کے رو سے اب ثابت ہو چکا ہے اس وقت کی باتوں کا بچہ کے دل و دماغ پر خاص اثر ہوتا ہے اور وہ نقوش اس کے دل و دماغ پر پیدا ہو جاتے ہیں جو مٹتے نہیں۔ فرانس میں ایک لڑکی تھی جو جرمن زبان میں سرمن پڑھتی تھی حالانکہ اسے کسی نے جرمن زبان سکھائی نہیں تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس لڑکی پر جنّ بھُوت کا اثر ہے مگر جب تحقیقات کی گئی تو پتہ چلا کہ جب وہ ابھی ایک سال کی تھی اُس وقت اس کی والدہ ایک جرمن پادری کے پاس ملازم تھی اور اس پادری کی عادت تھی کہ سرمن بلند آواز میں پڑھتا تھا چنانچہ وہی سرمن اس لڑکی کے دماغ میں بھی نقش ہو گئے اور وہ دَورے کی حالت میں انہیں دُہراتی رہتی۔ غرض بچہ کے کان میں اذان دینے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ اس طرح بچہ کو بڑے ہونے کے بعد عربی زبان

سے وابستگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اسے خیال ہوتا ہے کہ اس زبان کی آواز پہلے بھی کبھی میرے کان میں پڑ چکی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری حکمت بچہ کے کان میں اذان کہنے کی یہ ہے کہ ماں باپ یہ سمجھ لیں کہ بچہ کی تربیت کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ کئی ماں باپ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر تربیت حاصل کر لے گا حالانکہ وہ سخت غلطی پر ہوتے ہیں۔ جب بچے تعلیم حاصل کر لیتے ہیں تو کئی لڑکے اپنے اَن پڑھ ماں باپ کو پاگل سمجھنے لگتے ہیں اور بسا اوقات ان کی والدہ اگر کوئی بات کہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اماں تم نہیں جانتیں کہ یہ علمی بات ہے، پس بچے کی تربیت کا زمانہ اس کا بچپن ہی ہے، حضرت امام شافعیؒ نے ۹ سال کی عمر میں تمام دینی تعلیم کی تکمیل کر لی تھی۔ پس اذان یہ بتاتی ہے کہ تربیت کا کام بچہ کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور حقیقت میں وہی وقت ہوتا ہے جب ماں باپ اپنے خیالات کا اثر بچہ پر ڈال سکتے ہیں۔ غرض پہلے دَور میں جبکہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے خدا تعالیٰ خود بچہ کی تربیت کرتا ہے مگر دوسرے دَور میں اسے تربیت کے لئے انسان کے سپرد کیا جاتا ہے۔ یہی دَور قوموں پر بھی آتے ہیں جب خدا تعالیٰ کا کوئی مامور دنیا میں آتا ہے تو اس وقت اس کی قوم کا ابتدائی دَور بچہ کے اس پہلے دَور سے مشابہت رکھتا ہے۔ جبکہ وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس وقت خدا تعالیٰ خود تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، معجزات اور نشانات کے ذریعہ قوم کی تربیت ہوتی ہے اور وہ بمنزلہ ان غذاؤں کے ہوتے ہیں جو ماں کے پیٹ میں بچہ کو پہنچتی ہیں۔ بے شک مامورانِ الٰہی بھی ان کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں لیکن ان کا اس میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ماں کی خوراک کا خیال اس وقت رکھا جاتا ہے جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہو۔ خدا بھی اپنے رسول کی خود تربیت کرتا ہے اور اس کے ذریعہ امت کو خوراک مل جاتی ہے۔

پھر جسمانی تربیت میں دوسرا دَور جس طرح اس وقت شروع ہوتا ہے جب بچہ پیدا ہوا اسی طرح قوموں پر ان کی تربیت کا دوسرا دَور جب نبی کی وفات کے بعد آتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ کمزور لوگوں کی ایک نظام کے ماتحت تربیت کی جائے۔ جس طرح بچہ کے پہلے دَور پر قیاس کر کے کہ جب خدا تعالیٰ اسے پہلے دَور میں خود رزق دیتا رہا ہے کسی نادان کا یہ خیال کر لینا کہ دوسرے دَور میں بھی خدا تعالیٰ اسی طریق پر اس کے رزق کا انتظام کرے گا اور اس کی

مزید تربیت کی ضرورت نہیں بے وقوفی ہے۔اسی طرح قوموں کی ترقی کے ابتدائی دَور کی تربیت پر قیاس کر کے یہ نتیجہ نکالنا کہ دوسرے دَور میں بھی مزید عمل کی ضرورت نہیں نادانی ہے۔

نبی کے زمانہ میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نلکی لگا دی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ معجزات ونشانات کی خوراک قوم کو اس طرح مل جاتی ہے جس طرح بچہ کو ماں کے پیٹ میں خوراک ملتی ہے لیکن اگر بچہ کے دوسرے دور میں بھی ہم پہلی مثال پر قائم رہیں گے اور کہیں گے کہ جس طرح پہلے خدا تعالیٰ بچے کو کھلاتا رہا اسی طرح اب بھی کھلائے اور جس طرح پہلے سردی گرمی سے بچاتا رہا اسی طرح اب بھی بچائے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس کی غذا کا فکر کریں یا اسے کپڑے بنا کر دیں تو یقیناً ہم اس کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ دیکھو ماں جب تک بچہ اس کے پیٹ میں ہو تو براہ راست کوئی تربیت بچہ کی نہیں کر سکتی مگر دوسرے دور میں کر سکتی ہے۔اسی طرح قوم جب دوسرے دور میں آتی ہے تو سخت قوانین اور کڑوی دوائیوں کی اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک بچہ ماں کے پیٹ میں تھا جہاں وہ کسی چیز کا (انکار نہیں کر سکتا تھا) وہاں وہ اپنی مرض سے کسی چیز کو اختیار نہیں کر سکتا تھا لیکن پیدائش کے بعد اس میں تغیر آتا ہے اور کسی بات کو رد کرنا یا اختیار کرنا اس کی مرضی پر منحصر ہوتا چلا جاتا ہے۔یہی حال قوم کا ہوتا ہے اسے بھی دوسرے دور میں نئے عمل اور نئی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سخت نادانی کا خیال ہے کہ قوم کی پہلی سی تربیت کیوں نہ ہو کیونکہ یہ ایک طبعی تغیر ہے۔اگر بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ اسے کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں تو وہ ضرور مرے گا۔پس یاد رکھو کہ وہ تغیرات جن پر میں اس وقت زور دے رہا ہوں وہ ضروری ہیں کیونکہ اب ہماری جماعت پر وہ پہلا دور نہیں۔ جبکہ تواتر سے معجزات اور نشانات کا سلسلہ جاری تھا اور نہ اب وہ زمانہ ہے جسے خدا تعالیٰ نے لیلۃ القدر قرار دیا ہے اور جس کے متعلق قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ وہ ہزار ماہ سے بہتر ہے، اب وہ زمانہ واپس نہیں آ سکتا۔اس زمانہ میں تربیت خدا خود کرتا تھا اور کُلّی طور پر باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی مگر اب دوسرے دور میں وہ انسان کو سکھانا چاہتا ہے کہ وہ اپنی تربیت اپنے ہاتھ میں لے، اگر یہ زمانہ نہ آئے تو انسانی پیدائش کی غرض یقیناً باطل ہو جائے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[۲] یعنی

انسان کی پیدائش کی غرض یہ ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کے ساتھ میرا مظہرِ کامل بنے نہ یہ کہ میں اسے بنا دوں۔ گویا اس آیت میں ایک طرف انسان کو اپنا مظہر بتایا ہے اور دوسری طرف فرمایا ہے کہ یہ مظہریت قبول کرنا تمہارے اپنے اختیار میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس امر کو انسان کی اپنی مرضی پر چھوڑا ہے کہ وہ طوعی طور پر نہ کہ جبری طور پر اپنی پیدائش کی غرض کو پورا کرے۔ یہی انسانی جدوجہد کا وقت ہوتا ہے جس میں اسے اپنے علم اور تجربہ سے فائدہ اٹھا کر کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ شاگرد جو استاد کے پاس بیٹھا ہو اور وہ جو اپنے طور پر مطالعہ کرے دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پہلا اپنی ہر مشکل استاد کے سامنے پیش کر کے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن دوسرے کو اس غرض کے لئے کتابوں اور لغات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ پس تغیرات ضروری ہیں اور انہی تغیرات کا نام تحریک جدید ہے۔ اس تحریک کے تین بڑے حصے ہیں۔ اول مردوں کی اصلاح، دوسرے عورتوں کی اصلاح اور تیسرے بچوں کی اصلاح۔ دنیا میں کوئی قوم کامیابی حاصل نہیں کر سکتی جب تک کوئی مقصد اس کے سامنے نہ ہو اور اس کے لئے مرد عورت اور بچے سب مل کر کام نہ کریں۔ پس ہر جماعت کا فرض ہے کہ اپنے ہاں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی اصلاح کرے۔ عورتوں کی اصلاح کے لئے لجنہ کا قیام نہایت ضروری ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسے فرضِ کفایہ سمجھ لیا گیا ہے۔ چند عورتیں لجنہ میں شامل ہو جاتی ہیں اور باقی اپنے لئے اس میں شامل ہونا ضروری نہیں سمجھتیں۔ پس ضرورت ہے کہ ہر جگہ لجنہ اماء اللہ کا قیام ہو اور سب بالغ عورتیں اس میں شامل ہوں اور کوئی ایک عورت بھی ایسی نہ رہے جو اس سے باہر ہو۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے عورتوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ دہلی کے متعلق مجھے رپورٹوں سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ یہاں صرف دس بارہ عورتیں جمع ہوتی ہیں اور وہی لیکچر دے لیتی ہیں حالانکہ جب تک ایک عورت بھی باہر رہے اس وقت تک ہماری تنظیم مکمل نہیں ہو سکتی۔ لجنہ میں داخلہ کو اگر ہم نے ضروری قرار نہیں دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اس میں شمولیت کو غیر ضروری سمجھ لیں بلکہ ہمارا مقصد ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے اس میں شامل ہوں اور اس طرح انہیں ثواب اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوافل کو قُربِ الٰہی کا ذریعہ بتایا ہے لیکن آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم نوافل

کے متعلق کوئی پابندی نہیں عائد کرتے۔اسی طرح مثلاً میری خواہش یہی ہے کہ میرے بچے سرکاری ملازمت اختیار نہ کریں لیکن میں نے ان سے کبھی ایسا کہا نہیں کیونکہ اگر وہ میرے کہنے سے ایسا کریں گے تو اس کا ثواب مجھے ملے گا نہ کہ ان کو۔ یہی فائدہ اپنی امت کو پہنچانا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنظر تھا اور اسی لئے آپ نے نوافل کے متعلق کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ دوسری ضروری چیز مجلس خدام الاحمدیہ کا قیام اور اس میں شمولیت ہے۔ میں نے اس بارہ میں ابھی تک کوئی پابندی نہیں لگائی لیکن اگر کوئی باہر رہ جاتا ہے اور خدام الاحمدیہ میں شامل نہیں ہوتا تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہمیں نوجوانوں کو ایسے رنگ میں سمجھانا چاہئے کہ کوئی نوجوان اِس میں شامل ہونے سے نہ رہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ جو بڑے کام ہوتے ہیں ان کی تکمیل کے لئے ایک لمبے عرصہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عظیم الشان انعامات جن کے مانگنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے وہ بغیر بڑی قربانیوں کے نہیں مل سکتے۔ یہ بھی ایک غلطی تھی جس نے مسلمانوں کو تباہ کیا کہ انہوں نے سمجھ لیا صحابہؓ پر تمام ترقی ختم ہوگئی ہے حالانکہ اگر یہ صحیح ہو تو پھر ہمیں کیا ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ سے اسلام کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ خدا تعالیٰ نے تو قرآن کریم میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ [۳] کہہ کر یہ دعا سکھائی ہے کہ تم بڑے سے بڑے انعام طلب کرو۔ پس جب دعا سکھانے والے نے بخل سے کام نہیں لیا، دینے والے کے ہاں کمی نہیں، تو مانگنے والا کیوں مایوس ہو۔ صحابہؓ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی جب تک لوگ اس بات کو سمجھتے رہے ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے رُتبے دیئے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے دعوے بھی کئے لیکن جب ان کے دماغ چھوٹی چھوٹی باتوں پر راضی ہونے لگ گئے تو وہ تنزل میں گر گئے۔ ہمیں مسلمانوں کے اس تنزل سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور خدا تعالیٰ سے اس کی بڑی سے بڑی نعمت طلب کرنی چاہئے۔ ہاں روحانی نعمتوں کو معین طور پر مانگنا نادانی ہوتا ہے۔ طبیب کو ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بہتر سے بہتر نسخہ دے مگر یہ کہنا کہ معجون فلاسفہ دو یا ایسٹرن سیرپ دو بے وقوفی ہے۔ خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ مانگنے والے کے لئے کونسی روحانی نعمت بہتر ہوگی۔ مثلاً ایک شخص نفلوں کی توفیق اور اس کے ذریعہ قُربِ الٰہی مانگتا ہے حالانکہ ہوسکتا ہے کہ

اس کے لئے روزوں سے ترقی مقدر ہو۔ پس روحانی انعامات کو معین طور پر مانگنا قربِ الٰہی کے دروازہ کو اپنے اوپر بند کرنا ہے۔ ہاں جسمانی طور پر اولاد وغیرہ کے لئے کسی معیّن نعمت کا طلب کرنا منع نہیں لیکن روحانی لحاظ سے ہمیں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات طلب کرنے چاہئیں اور اس امر کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ کون سا انعام ہمیں دیتا ہے کیونکہ وہی اس امر کو بہتر سمجھ سکتا ہے کہ ہمارے قویٰ اور ہماری دماغی بناوٹ کے مناسبِ حال کونسا روحانی انعام ہے۔ غرض نسلوں کو درست رکھنا اعلیٰ مقاصد کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے مگر اس کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہے اور اس نظام کو قائم کرنے کے لئے مختلف تحریکات ہوتی رہتی ہیں۔ وہ لوگ جو اعتراض کرتے ہیں کہ یہ نئی چیزیں ہیں وہ غلطی پر ہیں اگر حالات کے مطابق ہم تبدیلی اختیار نہیں کریں گے تو عقل مندی سے بعید ہوگا۔ جیسے اگر کوئی شخص موٹر کو تعیّش کی چیز سمجھ کر اس سے کام نہ لے یا ریل کے ہوتے ہوئے پیدل سفر کرنے پر اصرار کرے تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ پس ضروری ہے کہ انعامات کے حصول کے لئے مقررہ نظام کے ماتحت سب دوست مل کر کام کریں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام جب دہلی تشریف لائے اور آپ یہاں کے بزرگوں کے مزارات پر تشریف لے گئے تو آپ نے فرمایا یہاں اتنے اولیاء اللہ دفن ہیں کہ اگر یہاں کے زندے توجہ نہ کریں گے تو ان بزرگوں کی روحیں تڑپ تڑپ کر فریاد کریں گی اور خدا تعالیٰ کا کام پورا ہو کر رہے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خواہشات میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی کہ دہلی احمدیت کو قبول کرنے سے محروم نہ رہے۔ پس سمجھ لو کہ آپ کی اِس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کتنی عظیم الشان کوششوں کی ضرورت ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل فرمایا کرتے تھے کہ میں جب لکھنؤ طب پڑھنے کے لئے گیا تو مجھ سے میرے استاد نے پوچھا کہ تمہارا کہاں تک طب پڑھنے کا ارادہ ہے۔ مجھے اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ سب سے بڑا طبیب کون گزرا ہے مگر میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا کہ افلاطون کے برابر۔ افلاطون اگرچہ فلاسفر تھا مگر استاد نے ان سے کہا شاباش تم نے بڑے آدمی کا نام لیا ہے اس سے تمہارا ارادہ بہت بلند معلوم ہوتا ہے تم کچھ نہ کچھ ضرور بن جاؤ گے۔ ایسا عزم اور ارادہ رکھنے والے نوجوانوں کی اب بھی ضرورت ہے

یاد رکھو حقیقی انسان وہی ہے جس کے مرنے پر لوگوں کو یہ خیال ہو کہ آج فلاں کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

میں نے دیکھا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت میں ابھی بہت نقص ہے اور اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ مجھے اکثر بچیوں کی پیشانی پر ابھی وہ بات نظر نہیں آتی جو ان کے نورِ ایمان کو کامل طور پر ظاہر کرنے والی ہو۔ بہت تھوڑے بچے اور نوجوان میں نے ایسے دیکھے ہیں کہ جن کی پیشانی پر میں نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ لکھا ہؤا دیکھا ہو اور وہ خدا تعالیٰ کے انعامات کو حاصل کرنے کے لئے پوری جدوجہد کرتے ہوں۔ اسی طرح میں بڑوں کو بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس امر پر غور کریں کہ وہ رات دن کے اوقات میں سے کتنا وقت خدا کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر جماعت یہ عزم کر لے کہ اگلے سال وہ دگنی ہو جائے گی تو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا[4] کا زمانہ بہت جلد آ سکتا ہے۔ اگر جماعت متحدہ طور پر ہمت نہیں کرتی تو کم از کم افراد یہ عہد کر لیں کہ وہ ایک ایک آدمی کو احمدی بنا کر دم لیں گے۔ یاد رکھو ایک ہی چیز ہے جس سے زندگی ملتی ہے اور وہ موت ہے۔ جب تک انسان موت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اس وقت تک وہ حقیقی زندگی نہیں پا سکتا۔ نطفہ کا کیڑا ابھی زندہ ہی ہوتا ہے لیکن جب وہ ماں کے پیٹ میں موت قبول کر کے ایک دوسری زندگی حاصل کرتا ہے تو اس کی وہ زندگی پہلی زندگی سے کتنی اعلیٰ اور کتنی بلند ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ ہؤا جب میں یہاں آیا تھا تو جماعت میں اس وقت صرف بیس پچیس دوست تھے میں نے نماز جمعہ پڑھائی تو میر قاسم علی صاحب (مرحوم) بڑے خوش تھے اور کہتے تھے اب تو ہم پچیس ہو گئے لیکن خدا تعالیٰ کے فضل سے اب ڈیڑھ دوسَو کے قریب یہاں ہماری جماعت کے آدمی ہیں اور اگر ہماری جماعت دعاؤں، اچھے نمونہ اور اصلاح وارشاد کے ذریعہ سے کوشش کرے تو ایک سال کے اندر اندر اپنی تعداد سے دُگنی ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں کو شکوہ ہے کہ میں ان کی دعوت قبول نہیں کر سکا لیکن انہیں سوچنا چاہئے کہ ایک آدمی آخر کہاں تک کھا سکتا ہے۔ میرا اصل کام خدا تعالیٰ کے دین کی اشاعت ہے اور جو شخص اس کام میں میری مدد کرتا ہے وہی میرا دوست ہے۔ یہی وہ مہمان نوازی ہے جو ہر شخص کر سکتا ہے۔ پس میری اگر خواہش ہے

تو یہ کہ اگر خدا تعالیٰ مجھے پھر یہاں آنے کا موقع عطا فرمائے تو میں دیکھوں کہ سب عورتیں لجنہ میں شامل ہیں، سب نوجوان خدام الاحمدیہ کے پروگرام پر کاربند ہیں اور سب لوگ سرگرمی سے اصلاح وارشاد کے کام میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے ساتھ ہو۔ آمین۔''

(الفضل ۱۵ ؍جون ۱۹۶۰ء)

---

۱ کنز العمال جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۹۔ مطبوعہ حلب ۱۹۷۷ء

۲ الذّٰرِیٰت: ۵۷ ۳ الفاتحۃ: ۶، ۷ ۴ النصر: ۳